عساکر پاکستان کے اردو سفرنامے۔اجمالی جائزہ

ڈاکٹر طاہرہ سرور

Dr. Tahira Sarwar

Assistant Professor, Department of Urdu,
Lahore College for Women University, Lahore.

Abstract:

Association between military persons and literature has always been very strong.The Pakistan army has a great contribution in Urdu literature.They have a great work in Urdu prose and poetry both. In prose, they wrote Novels, Short stories, Auto Biographies, History and Columns etc. Similarly, in Poetic section, these officers wrote Ghazals, Poems and Parodies etc.In this article travelogues in urdu language of usakir e Pakistan are to be presented.

افواجِ پاکستان کے اہل قلم نے بے شمار اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جملہ اصناف سخن، غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، پیروڈی وغیرہ اور نثر کے حوالے سے ناول، افسانہ، آپ بیتی، خاکہ، سفرنامہ، تاریخ، کالم نویسی، ترجمہ غرض یہ کہ ادب کی ہر جہت میں اپنی روشنائی سے چراغ روشن کیے ہیں۔زیرِ نظر مضمون میں افواج پاکستان کی اہم ادبی شخصیات کا تعارف اور ان کے تحریر کردہ اردو سفرناموں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ بریگیڈیئر گلزار احمد

بریگیڈیئر گلزار احمد یکم جنوری ۱۹۰۹ء کو کھجولہ، ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔۱۹۲۵ء میں مشنری سکول ڈلوال سے میٹرک، ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایف اے اور ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔۱۹۳۱ء میں فوج میں سپاہی بھرتی ہوگئے۔اعلیٰ تعلیم کی بنا پر ۱۹۳۲ء میں کمیشن مل گیا۔ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون کے اولین کیڈٹس میں سے تھے۔ڈھائی سال اکیڈمی میں رہنے کے بعد انہیں جھانسی بھیجا گیا۔فوجی ملازمت کے دوران میں انہیں عراق، بصرہ، بغداد، ایران، ہمدان، بمبئی، دلی اور آگرہ رہنے کا موقع ملا۔۱۴ جولائی ۱۹۴۰ء کو کیپٹن، ۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو میجر، ۴ اپریل ۱۹۴۶ء میں لیفٹیننٹ کرنل، ۱۹ جولائی ۱۹۴۸ء میں فل کرنل اور ۱۷ نومبر ۱۹۴۸ء کو بریگیڈیئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔فوجی ملازمت کے دوران میں انہیں عراق، بصرہ، بغداد، ایران، ہمدان، بمبئی، دلی اور آگرہ رہنے کا موقع ملا۔۱۹۵۷ء میں ان کی تعیناتی بغداد پیکٹ کے عملے میں ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں ترکی گئے جہاں معاہدہ سینٹو کی نمائندگی کی۔۱۹۶۳ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا۔بریگیڈیئر گلزار احمد کا انتقال ۲۴ ستمبر ۱۹۹۸ء کو راولپنڈی میں ہوا اور آبائی گاؤں کھجولہ میں سپردِ خاک

کیے گئے۔ان کے سفرناموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔تذکرہ افریقہ

اس سفرنامہ میں مصنف نے اپنے افریقہ کے قیام کی روداد بیان کی ہے۔افریقہ کا براعظم ''ٹوگو'' بہت عرصے تک نوآبادیات قائم کرنے والی مختلف طاقتوں کی آماجگاہ بنا رہا لیکن آخر وہ وقت آیا جب افریقہ کی غلامی کی سیاہ رات ختم ہوئی اور اس خطے کے افق پر آزادی کا سورج طلوع ہوا۔جب ارض افریقہ کے مختلف ممالک اپنی جدوجہد میں کامران ہوئے تو پاکستان نے ان نوآموز ملکوں کے جشن آزادی میں شرکت کی خاطر ایک وفد افریقہ روانہ کیا۔بریگیڈیئر گلزار احمد اسی وفد کے ایک ممتاز رکن تھے اور یہ کتاب اسی سفر کی یادداشت ہے۔''تذکرہ افریقہ'' ایک ایسی سفری ڈائری ہے جس میں مصنف نے مختلف مقامات کو تاریخ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔گلزار احمد کا اسلوب نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔اس مختصر سفرنامے میں فکر و مشاہدے کی گہرائی بھی ملتی ہے۔مثلاً:

> ''دوپہر کا کھانا مقامی دولتِ مشترکہ کی طرف سے تھا ہم بھی مدعو تھے۔کھانا شروع ہونے سے قبل مقامی لاٹ پادری کو جو حکومت کے وزیر بھی ہیں بسم اللہ پڑھنے کو کہا گیا۔بسم اللہ کسی زبان میں پڑھی جائے اس پر ہمیں اعتراض نہیں البتہ مسلمان ملک میں عیسائی رسومات کے مطابق بسم اللہ پڑھی جائے اور ملک کی اکثریت کا مذہبی رہنما وہاں بلایا تک نہ گیا ہو ہمیں ناگوار گزرا۔''(۱)

مصنف افریقہ کی زندگی کا اپنی دیہاتی زندگی کے ساتھ موازنہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً:

> ''اسٹیڈیم کا منظر بالکل اپنے ہاں کے دیہات کے میلوں جیسا تھا۔اگر آپ نے کوہستان نمک میں چوعہ سیدن شاہ کے میلہ پڑکودی کے میدان کا منظر دیکھا ہے تو یوں سمجھیے کہ گندمی اور گورے رنگوں کے چہروں کی جگہ اگر سیاہ چہرے بدل دیئے جائیں تو کچھ مناسبت سی پیدا ہو جائے گی۔وہاں رنگوں کی گہرائی اپنے ہاں سے کچھ زیادہ پنجاب، سرحد کے مقابلہ میں یہاں کے لوگ زیادہ قدآور اور بھاری بھرکم ہیں۔پرانے زمانے میں پنجاب کے دیہات میں عورتوں کی باریک چونڈیں گوندھی جاتی تھیں۔یہاں ان سے بھی باریک چونڈیں گوندھی جاتی ہیں مگر رخ اوپر کی جانب تھا۔''(۲)

گلزار احمد کی یہ سفری ڈائری بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے۔اس میں اس افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں کا ذکر ہے جہاں ہم نے کبھی اذانیں دی تھیں اور جہاں آج پھر وہی اذانیں گونج رہی ہیں۔اس کتاب میں افریقہ کی ملکی سیاست اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔مصنف نے صاف اور سیدھے انداز میں تمام حالات و واقعات کو تحریر کر دیا ہے۔

۲۔تذکرہ چین

بریگیڈیئر گلزار احمد کا سفرنامہ ''تذکرہ چین'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔یہ سفرنامہ آٹھ ابواب میں منقسم ہے۔پہلے میں تاریخ کا بیان ہے، دوسرے میں انقلاب، تیسرے میں معاشرتی تنظیم، چوتھے میں تعلیم، پانچویں میں زراعت پھر صنعت،

سیاحت وتفریح اور آخر میں چین اور عالمی سیاست کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ بریگیڈیئر گلزار احمد چین کی ترقی کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ چین نے ہم سے دو سال بعد آزادی حاصل کی اور وہ کہاں سے کہاں جا پہنچے اور ہم ابھی منصوبہ بندی کی حدود کو عبور نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ مصنف یہ بیان کرتے ہیں کہ چین نے تشکیل معاشرہ کو ایسے خطوط پر مرتب کیا کہ ہر گاؤں اپنے اپنے ''کمیون'' کی رہبری میں ترقی کر رہا ہے جب کہ ہمارے ہاں یونین کونسل ہے جو دکھاوے کی ہے جس سے آج تک سوائے سیاسی رسہ کشی کے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ گلزار احمد کو چین میں معاشرے کی تشکیل وترتیب بہت متاثر کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شہر پہنچ کر آپ سائیکلوں کے سیلاب سے گزر کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچتے ہیں، ہزاروں لاکھوں سائیکلیں، مگر یہ آپس میں ٹکراتی کیوں نہیں؟ پیدل پٹریوں پر بھی بھیڑ ہے مگر دھکم پیل نہیں۔ دو تین روز کے قیام کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہاں اس شہر میں اور یقیناً دوسرے شہروں میں بھی یہی ہوگا کہ اس قوم نے اپنے معاشرہ کو کچھ اس طرح تربیت اور تشکیل دی ہے کہ پوری قوم ایک ہی لباس میں ملبوس صبح تا شام، کام، کام، اور پھر کام کی رٹ لگائے، سر جھکائے رواں دواں ہے۔ جب ہزاروں کے مجمع میں کوئی مرد کسی دوسرے مرد سے الجھتا نہیں، ٹکراتا نہیں، سکول سے لوٹتے ہوئے کوئی بچہ دوسرے بچے کے ساتھ دست وگریبان نہیں ہوتا، کوئی پاس سے گزرتے ہوئے سائیکل سے نہیں ٹکراتا، بازاروں میں نہ جھگڑا نہ جھیڑا، نہ گالی نہ گلوچ، کام کے دوران اور راستوں پر سنجیدہ چہرے البتہ سیر وتفریح کے وقت ہنستے، مسکراتے، تصویریں کھینچتے اور روکھی سوکھی کھا کر ہشاش بشاش مرد وزن یہ ضرور کسی سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ ہوگا۔''(۳)

مصنف کا کہنا ہے کہ چین میں اعلیٰ افسروں اور ان کے ماتحتوں کے بچے یکساں تربیت حاصل کرتے ہیں بلکہ غیر مسلموں اور غیر ملک سے آئے ہوئے طلبہ کو بھی وہی مراعات حاصل ہوتی ہیں جو وہاں کے مقامی لوگوں کو حاصل ہیں۔ تعلیم کے معاملے میں حکومت نے فیصلہ دیا ہے کہ خواندگی ''جونیئر مڈل سکول'' تک لازمی ہے۔ اس لیے کوئی ایسا بچہ نہیں جسے ناخواندگی کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ مصنف کے نزدیک ایک طرف برصغیر کے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ حالت سے جہالت کے اندھیرے میں پہنچنا اور دوسری طرف چین کے ہر فرد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر لینا ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ کسی کو جاہل رکھنا یا بنانا ہو تو تعلیم حکومت کی تحویل میں دے دی جائے۔ اگر پوری آبادی کو پڑھا لکھا بنانا ہو تو ذمہ داری خود معاشرے کے حوالے کر دی جائے۔

''ثقافتی انقلاب'' کے خاتمے پر چین نے داخلی اور خارجی امور میں جس تبدیلی کا اظہار کیا اور اس انقلاب کو مکمل طور پر رد کر کے جو نئی اور نسبتاً آزاد راہیں اختیار کی ہیں ان سے آزاد دنیا میں چین کے بارے میں جاننے کی خواہش بھی نسبتاً زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ''تذکرہ چین'' کے ذریعے ہمیں چین کی غیر معمولی بیداری اور ترقی کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عطش درانی:

> ''انہوں نے ''تذکرہ چین'' کو اپنے سفر نامہ چین کا حصہ بنا کر تفصیلی معلومات بھی فراہم کی ہیں اور تاثرات ومشاہدات بھی تاریخ سے لے کر معیشت تک کو اپنا موضوع بناتے ہوئے

آخر میں عالمی سیاست میں چین کی حیثیت کا جائزہ بھی لیا ہے۔ یوں یہ تذکرہ چین کی پراسرار حقیقتوں سے آگاہی کے لیے ایک اہم اور بنیادی ماخذ ثابت ہوتا ہے۔''(۴)

۳۔تذکرہ سنکیانگ

''تذکرہ سنکیانگ'' ایک معلوماتی سفرنامہ ہے۔اس میں عہد جدید کے چین میں مسلمانوں کے تمدن کو اس کے تاریخی پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ سفرنامہ کل آٹھ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب پس منظر کا ہے جب کہ بعد میں خنجر آب، کاشغر، ارمچی، ترمنسان، ختن، یارقند، تکلا مکان کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ بریگیڈیئر گلزار احمد کے مطابق سنکیانگ جانے کا مقصد اصل میں سیر و سیاحت نہ تھا۔ یہ تو صرف اظہار و جستجوئے محبت کا سفر تھا۔ دوستی اور دوستانہ تعلقات اور جذبات اخوت کو فروغ دینے کا بہانہ تھا اور لفظ ''محبت'' کو ''شکریے'' کے معنوں میں سننے اور ادا کرنے کا سلسلہ تھا۔ اس لیے سے سفرنامہ کہنے کی بجائے محبت و مشقت کی مختصر سی داستان کہا جائے تو بہتر ہے۔''(۵)

''تذکرہ سنکیانگ'' پاکستان کے قریب ترین دوست چین کے ساتھ قدیم روابط کی قلبی فضا کا سفرنامہ ہے۔ مصنف نے قاری کو زیادہ سے زیادہ معلومات مہیا کی ہیں اور اپنے قلم کو زیادہ تر شہروں کی جغرافیائی حدود تک محدود رکھا ہے۔ انھوں نے چین کا ماضی و حال، موجودہ بود و باش، ذرائع نقل و حمل اور مالی وسائل، تجارت، حتیٰ کہ تاریخی عمارات اور باغات کی تفصیل بھی مکمل دی ہے۔

۴۔تذکرہ حجاز

بریگیڈیئر گلزار کا آخری سفرنامہ ''تذکرہ حجاز'' ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ یہ بظاہر سفر حرمین شریفین کا تذکرہ ہے لیکن اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے۔ جذبے اور شدت احساس کی کیفیت اس سفرنامے میں ہر جگہ موجود ہے۔ مثلاً:

''کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا مانگنے کا خیال ہی کافور ہو چکا تھا، شاید زبان سے یہ فقرہ بھی ادا ہو گیا ہو کہ کیا مانگوں، مگر کچھ یاد نہیں آ رہا اور پھر یہ مسافر تقریر تخاطب کی قوت سے بھی محروم ہو گیا۔ ذہن کی سطح سے ہر شے غائب ہو چکی تھیں حتیٰ کہ خود اپنے آپ کا احساس نہ تھا۔ آنکھیں بیت اللہ کے چوکون مکان کے سیاہ غلاف اور اس کے دروازے پر تھیں۔ اس سیاہ پردے کے اندر سے ان آنکھوں کو الا العالمین کے عرش سے پھیلی ہوئی نوری شعاعوں کا دریا اُمڈتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔''(۶)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضری کے وقت گلزار احمد پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور الفاظ ان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''آج تو موقع تھا کہ تقریر و خطابت کے جوہر پیش کرتا اور آج ہی اس کے گناہ آلود ذہن نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہائے محرومی و ناکامی، آنکھیں خلا میں جم چکی تھیں مگر اس خیال نے

اس کے سیل گریاں کو اور بھی تیز کر دیا۔''(۷)

بریگیڈیئر گلزار ارکان اسلام کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ان کی نگاہ میں اسلام کے تربیتی نظام کا عملی پہلو نماز سے شروع ہوتا ہے۔نماز فرد اور جماعت دونوں کو کامیاب زندگی کی صحیح راہ پر قائم رکھتی ہے۔مصنف کا کہنا ہے:

''قرب الٰہی کا بہترین اور کامل ترین نسخہ نماز ہے۔نماز اس عبودیت کا عملی مظہر ہے جو کلمہ طیبہ میں مضمر ہے۔نماز انسان کے قلب و ذہن پر خالق ارض وسما اور مالک سزا و جزا کی بزرگی، اس کی قدرت، اس کی رحمت اور اس کی ربوبیت کو دن میں پانچ مرتبہ ثبت کرتی رہتی ہے۔''(۸)

''تذکرہ حجاز'' میں کتاب کا مرکز ومحور اسلام کی دو بنیادی تعلیمات حج اور جہاد کا تنقیدی جائزہ لینا اور اس کی اہمیت و افادیت اور اس کے باہمی روابط کو ثابت کرنا ہے۔اس میں مصنف نے حج کو تنظیمی اعتبار سے جہاد کی خشت اول قرار دیتے ہوئے اس کی فرضیت پر ملت اسلامیہ کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔بریگیڈیئر گلزار احمد کا انداز بیان سیدھا سادہ اور رواں ہے بلکہ بعض مقامات پر تو ایسی سماں بندی کی گئی ہے کہ ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔یہ سفر نامہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں مقدس مقامات کی تاریخی اور عسکری حیثیتوں پر بحث کی گئی ہے۔

کیپٹن عطار رسول (شاکر کنڈان)

اصل نام عطار رسول اور قلمی نام شاکر کنڈان ہے۔۲۰ جون ۱۹۵۱ء کو موضع کنڈان تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل سکول، شاہ پور سے حاصل کی۔میٹرک کا امتحان جوہر میموریل ہائی سکول، جوہر آباد سے ۱۹۶۷ء میں پاس کیا۔۱۹۷۱ء میں پاک فوج میں سپاہی کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔۱۹۷۹ء میں آمڈ سروسز بورڈ سے ایف اے،۱۹۹۳ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے بی اے،۲۰۰۷ء میں سرگودھا یونیوسٹی سے ایم اے اردو اور ۲۰۱۰ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم فل اردو کیا۔انھوں نے شبانہ روز محنت سے پاک فوج میں اپنی ذمہ داریاں بھرپور اور احسن طریقے سے نبھائیں اور ساتھ ساتھ تعلیم پر بھی توجہ مرکوز کیے رکھی۔چنانچہ ۱۹۷۸ء میں پہلا پروفیشنل کورس مکمل کیا اور ۱۹۷۹ء میں انسٹرکٹر سکول آف آرمز میں تعیناتی ہوگئی۔۱۹۸۱ء میں سعودی عرب سے کورس کیا اور اڑھائی سال تک وہیں مقیم رہے۔سعودی عرب سے واپسی پر حوالدار بن گئے۔۱۹۸۸ء میں کمیشن کے لیے اپلائی کر دیا اور ۱۹۸۹ء میں لیفٹیننٹ بن گئے اور ترقی کرتے کرتے کیپٹن کے عہدے تک جا پہنچے اور ۲۰۰۱ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

جادہ شوق ومحبت

''جادہ شوق ومحبت'' شاکر کنڈان کا حجاز مقدس کا سفر نامہ ہے۔انھوں نے ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں اڑھائی سال گزارے، حج کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے اور عمرے ادا کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔ان تمام مشاہدات کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اس کتاب میں بیان کیا ہے۔شاکر کنڈان ''جادہ شوق ومحبت'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جادۂ شوق ومحبت'' نام سے ظاہر ہے یعنی شوق اور محبت کا راستہ۔اگر اس پر غور کیا جائے تو

واضح ہو جاتا ہے کہ یہ شوق و محبت کا راستہ کس دھرتی کا ہو سکتا ہے۔ میرا اپنا وطن یا پھر میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کا وطن۔ اس میں میرے جذبات اور احساسات قلمبند ہوئے ہیں بلکہ میں یہی کہتا رہتا ہوں کہ یہ سفر نامہ میں نے لکھا نہیں، مجھ سے خاص طور پر لکھوایا گیا ہے۔''(۹)

''جادہ شوق و محبت'' صرف حج کا سفر نامہ ہی نہیں بلکہ معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بھی ہے۔ انھوں نے تمام تاریخی مقامات کا ذکر ان کی تاریخی حیثیت کے ساتھ کیا اور خانۂ خدا میں اپنے قیام کا ذکر کعبۃ اللہ کی تاریخ کو حضرت آدمؑ سے شروع کر کے نبی اکرم ﷺ تک بیان کیا اور اس کی تعمیر کی تاریخ جو موجودہ دور تک ہوئی جس میں خانہ کعبہ کی لمبائی چوڑائی اور اس کے اندر تمام مقدس مقامات کی تاریخ و تعمیر شامل ہے، سب کو احاطۂ تحریر میں لا کر قاری کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح مصنف نے مسجد نبوی اور اس کی تمام مقدس جگہوں مثلاً صفہ، مقام جبریل، حجرات مقدسہ اور گنبد خضراء کی تفصیل کو ان کی تاریخ سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ مدینہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس بستی کو آج ہم مدینہ کے نام سے پہچانتے ہیں، صدیوں پہلے اس خطے کو لوگ یثرب کے نام سے یاد کرتے تھے اور یہ اس کا قدیمی نام تھا۔ چوں کہ اس کا مطلب کلامِ عربی میں فساد ہے، اس لیے حضور ﷺ نے اس مقدس شہر کو اس نام سے پکارنے کی ممانعت فرما دی اور اسے طیبہ اور طاہر سے بدل دیا، پھر آپ کی نسبت سے لوگ اسے مدینۃ النبی (پیغمبر کا شہر) کہنے لگے۔''(۱۰)

حضور ﷺ کے روضۂ انور کی زیارت کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں کرتے ہیں:

''عقل کے تمام دلائل کو راستے سے ہٹاتے ہوئے عشق کی تڑپ نے دل کے ساتھ ساتھ میرے وجود کو بھی کھینچ لیا اور لے جا کر اس مقدس چار دیواری کے سامنے کھڑا کر دیا، جس کے اندر سراجِ چرخِ نبوت، چراغِ بزم رسالت، حریمِ خلدِ نگہت، شعاعِ نور کی طلعت، شرحِ آیتِ رحمت، کفیلِ بخششِ امت، قسیمِ نکہت و نزہت، نسیمِ گلشنِ فطرت، امینِ رازِ حقیقت، دلِ حزیں کی راحت، ظہورِ جلوۂ وحدت، بہارِ گلشنِ رحمت، بزمِ دہر کی زینت، جمالِ روئے حقیقت اور شفیعِ روزِ قیامت، محمد مصطفیٰ ﷺ آرام فرما ہیں۔۔۔ جالیوں کے قریب کھڑے ہو کر درود و سلام بھیجا اور ان الفاظ کے ساتھ ہٹ کر نمازِ تہجد میں مصروف ہو گیا۔''(۱۱)

مصنف نے ''جادہ شوق و محبت'' میں پاکستان اور سعودیہ کے حالات کا آپس میں موازنہ بھی کیا ہے۔ مثلاً سعودی عرب میں نظامِ صحت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میں نے ایک ہسپتال میں دیکھا کہ ایک ڈرگ سٹور کے سامنے دوائیاں لینے کے لیے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ایک بریگیڈیئر آیا اور قطار میں آ کر اپنے نمبر پر کھڑا ہو گیا۔ اس لمحے مجھے اپنا وطن شدت سے یاد آیا، جہاں ہسپتال تو ہوتے ہیں لیکن قطار میں صرف غرباء ہی دکھائی

دیتے ہیں۔افسران یا امراء اس صف سے بالا ہوتے ہیں۔''(۱۲)

''جادہ شوق ومحبت''میں اردن کے بارڈر کی سیاحت کا مختصر ذکر بھی موجود ہے۔حضرت موسیٰؑ اور حضرت صالحؑ کے زمانے کی تباہ حال بستیوں کے بارے میں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے۔جیسے ہم بھی ان بستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔الغرض شاکر کنڈان کا یہ سفر سیاحتی ہی نہیں بلکہ ہماری عظیم تاریخ میں بھی دور تک ان کے ذہن اور علم کا ایک سفر ہے۔ ''جادہ شوق ومحبت''ایک ایسا سفرنامہ ہے جس میں مصنف نے نہ صرف اپنے احساسات وجذبات کا ذکر بے حد دلکش انداز میں کیا ہے، بلکہ اسے پڑھ کر معلومات میں بھی بے حد اضافہ ہوتا ہے۔اس اعتبار سے یہ سفرنامہ اعلیٰ افادیت کا حامل بن جاتا ہے۔

کرنل محمد خان

کرنل محمد خان اُردو کے صاحب طرز مزاح نگار ہیں۔وہ ۵ اگست ۱۹۱۲ء کو ضلع چکوال کے ایک قصبے بل کسر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول، چکوال سے میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔۱۹۲۹ء میں ایف ایس سی، ۱۹۳۱ء میں بی ایڈ کیا۔پھر ۱۹۳۴ء میں ایم اے اقتصادیات اور ۱۹۳۵ء میں بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔تین چار سال مختلف سکولوں اور کالجوں میں لیکچرار رہے۔۱۹۴۰ء میں فوج میں بطور کیڈٹ منتخب ہو کر او ٹی ایس مہو (وسط ہند) پہنچے اور مئی ۱۹۴۱ء میں ''نیم لیفٹیننٹ'' کے عہدے پر فائز ہو گئے۔انھوں نے لیفٹیننٹ اور کپتان کی زندگی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان لیبیا کے صحراؤں، قاہرہ کے کیمپوں، برما کے جنگلوں اور بہار کی چھاؤنیوں میں گزاری ہے۔قیام پاکستان کے بعد پاک فوج سے وابستہ ہوئے۔۱۹۵۲ء میں کرنل کے عہدے پر ترقی ہوئی۔۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۹ء کا عرصہ جی ایچ کیو راولپنڈی رہے۔۱۹۶۹ء میں مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔

بسلامت روی

کرنل محمد خان کی کتاب ''بسلامت روی'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔یہ ان کے انگلستان کے سفر کی رُوداد ہے جو انھوں نے انگلستان کے محکمہ تعلیم کی دعوت پر کیا اور واپسی پر وہاں پیش آنے والے واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا۔اس کتاب کے بارے میں نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''یہ سفرنامہ خالص ادبی مزاح نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔۳۱۴ صفحات کی اس کتاب کو کہیں سے بھی کھول لیجیے۔محمد خاں کی گل افشانیٔ گفتار کی خوشبو آپ کے دل ودماغ کو معطر کر دے گی۔اس میں آورد نہیں آمد ہے۔بے ساختگی ہے پرکاری ہے اور ایک ایسا اچھوتا ذائقہ ہے جس سے کام ودہن ابھی تک نا آشنا تھے۔''(۱۳)

کرنل محمد خان کا یہ سفر راولپنڈی سے لاہور، کراچی، بیروت، جینوا، لندن، پیرس، فرنیکفرٹ، استنبول اور تہران تک پھیلا ہوا ہے جس میں ''مقدمہ'' کے علاوہ کل نو ابواب قائم کیے گئے ہیں۔مقدمہ کا آغاز ایک پروفیسر کے خط سے لیے گئے اقتباس سے ہوتا ہے جس میں ایک طالب علم نے مصنف محمد خان اور محمد خان ڈاکو کو نہایت دلچسپ انداز میں گڈمڈ کر دیا ہے۔ کتاب کے پہلے تین ابواب سفری تیاریوں سے متعلق ہیں۔پہلے باب میں جی ایچ کیو سے رخصت لینے اور 'خونخوار صاحب'' کا

تذکرہ ہے۔ دوسرا باب اپنی تنخواہ کو برطانوی پونڈوں میں تبدیل کروانے کی ''مہم'' پر مبنی ہے جب کہ تیسرے باب میں کراچی کے مختصر قیام میں ابن انشا سے سفری ہدایات لینے اور آغا غلام حسین کے توسط سے دو مختلف خاندانوں سے کی جانے والی ملاقاتوں کا ذکر ہے۔

''بسلامت روی'' میں کرنل محمد خان نے مزاح پیدا کرنے کے لیے مزاحیہ صورت واقعہ، کردار نگاری اور شعری و ادبی اصطلاحات کا نہایت اعلیٰ استعمال کیا ہے۔ ایک موقع پر جہاں پونڈ ملنے کی دشواری کا ذکر کرتے ہیں، وہاں حسرت موہانی کی سادگی کا ذکر بڑے دلچسپ انداز سے کیا ہے:

> ''اب ہر چند کہ انگریزوں سے تاریخ مقرر کر کے پورا ایک مہینہ دیر سے پہنچنا مناسب نہ تھا تا ہم زرمبادلہ کے بغیر سفر بھی خارج از بحث تھا۔ زرمبادلہ کے بغیر وعدے کی پابندی کی تو ایک ہی صورت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں افسری کی بجائے مولانا حسرت موہانی کی طرح درویشی عطا کی ہوتی اور ہم ایک لوٹا، خالی جیب، عالی ظرف اور اللہ کا نام کے کر منہ اندھیرے گھر سے چل نکلتے لیکن قسامِ ازل نے ہمیں درویشی کی بجائے افسری کے قابل ہی سمجھا تھا اور افسری کا خاصہ ہے کہ عالی ظرفی کے بغیر تو چل سکتی ہے لیکن زرمبادلہ کے بغیر دھک سے رک جاتی ہے۔''(۱۴)

کرنل محمد خان زندگی کے عام اور ہلکے پھلکے پہلو لے کر ان سے اعلیٰ درجے کا مزاح پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں سیاحت کے دوران میں بار بار وطن کی یاد ستاتی ہے۔ بیروت پہنچنے پر پی آئی اے کا دفتر نظر آنے پر اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''دو چار قدم ہی چلے تو سامنے ایک عمارت کی پیشانی پر سبز پاکستانی رنگ کے تین مانوس انگریزی حروف نظر آئے PIA: دفعتاً ساری اجنبیت، ساری کوفت دور ہوگئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وطن میں ہم پی آئی اے کے دفتر کے سامنے سے اس طرح گزر رے جاتے ہیں جیسے غیروں کا گھر ہو لیکن کسی غیر ملک کی گلیوں سے گزرتے ہوئے یہ تین سبز حروف نظر آ جائیں تو یوں لگتا ہے جیسے سسرال ہو۔''(۱۵)

کرنل محمد خان جب کسی ملک کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کا بھی بھرپور نقشہ کھینچتے ہیں۔ بیروت کی عمارتوں کی بلندی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''ایک جگہ کار سے نکل کر بازار میں چند قدم چلے تو یک لخت احساس ہوا کہ ہمارا قد سکڑ کر بقدر تین فٹ رہ گیا ہے۔ ولید سے شکایت کی تو بولے اللہ آپ کی درازیٔ قامت کا نگہبان ہو۔ آپ کا قد نہیں سکڑا۔ صرف دونوں طرف کی عمارات بلند ہوگئی ہیں۔ یہ بائیں ہاتھ والی دس منزلہ ہے، دائیں ہاتھ والی پندرہ منزلہ، سامنے بائیس منزلہ اور ذرا آگے چالیس منزلہ، یہ بالشتیے جو آپ کو فٹ پاتھ پر رینگتے نظر آ رہے ہیں بالغ مرد و زن ہیں اور وہ رینگ نہیں رہے

ہماری طرح پاؤں کے بل چل رہے ہیں۔''(۱۶)

کرنل محمد خان لبنان سے ہوتے ہوئے استنبول اور پھر جنیوا پہنچ جاتے ہیں۔سوئٹزر لینڈ کا حسن انہیں بہت متاثر کرتا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''سبحان اللہ۔ یہ کسی قطعۂ ارض کی جھلک ہے یا حسن ازل کی نمود! خدایا تو نے کن کہتے ہوئے کیا دو قسموں کی تخلیق کا حکم دیا تھا؟ سٹینڈرڈ اور ڈیلکس؟ عام اور خاص؟ میرے سامنے یہ وہ زمین تو نہیں جسے دیکھنے کا میں عادی ہوں۔ یہ کافر کوہساروں کے سانولے سرمئی سلسلے، یہ سبزو کبود وادیوں کے ریشم میں لپٹے ہوئے نشیب و فراز، یہ دلربا بلندیاں، یہ پرفسوں پستیاں، یہ پہلوئے کوہ کی سلوٹوں میں رنگ رنگیلی بستیاں، یہ سرخ چھتوں والے بے شمار کاٹیج، یہ بکھری ہوئی بیر بہوٹیاں، یہ چھڑکی ہوئی روبیاں، یہ رنگ روپ کے بدلتے ہوئے سین جیسے قدرت کسی باتصویر کیلنڈر کے صفحے اُلٹ رہی ہو۔ اللہ! یہ باغ و راغ تو نے کس کارخانے میں بنائے ہیں؟ یہ سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں؟''(۱۷)

کرنل محمد خان ساتویں باب ''انگلستان: شہر اچھے کہ بن؟'' میں لندن کی سیاحت کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں کرتے ہیں۔لندن میں مختلف لائبریریوں اور ان کے حسن انتظام کو دیکھ کر بے حد سراہتے ہیں اور ان کا موازانہ اپنے ملک کی لائبریریوں سے بھی کرتے ہیں۔اس کتاب کا آخری باب ''چار شہر: اڑتے خاکے'' ہے جس میں کرنل محمد خان، فرانس، جرمنی، ترکی اور ایران کے سفر کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرنل محمد خان کا کلاسیکی اور جدید ادب کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔خصوصاً شاعری کا جو ''بسلامت روی'' کے پس منظر میں ہمہ وقت محسوس ہوتا ہے۔ان کے ہاں تلمیحات کا بروقت اور برمحل استعمال ملتا ہے۔ڈاکٹر غلام جیلانی برق ''بسلامت روی'' کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''وہی بجنگ آمد والی حلاوت، لطافت، ظرافت، سلاست، بانکپن اور شگفتگی ہے۔فرق ہے تو یہ کہ اس میں زبان کا چٹخارہ یعنی شعریت اور ادبیت زیادہ ہے اور اس میں بے ساختہ پن زیادہ ہے۔''(۱۸)

کرنل غلام سرور

کرنل غلام سرور ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔گورنمنٹ ہائی سکول، جہلم سے میٹرک، گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے ایف اے اور بی اے کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ایم اے انگریزی کرنے کے بعد بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج چکوال میں تعینات ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں پاک فوج کی ایجوکیشن کور میں بطور کمشینڈ آفیسر شمولیت اختیار کر لی جہاں درس و تدریس کے علاوہ انتظامی عہدوں پر خدمات سرانجام دیں۔فوج میں رہتے ہوئے انھوں نے ایم اے اُردو اور ایم اے اسلامیات کیا۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں تقرری کے دوران ایجوکیشن کور کے مجلّہ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ان کی سب سے اہم تقرری، بطور لائبریری آفیسر نیشنل ڈیفنس کالج، راولپنڈی کی تھی جہاں تقریباً پندرہ برس تک خدمات سرانجام دیں۔ کرنل غلام سرور ۱۹۸۸ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے۔ بعدازاں مختلف اردو اور انگریزی اخبارات میں کالم نگاری کرنے لگے۔کرنل غلام سرور کو ان

کی گراں قدر خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ادبی حوالے سے پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے دس ہزار روپے انعام دیا گیا اور انجمن ترقی اردو کراچی نے ''بابائے اُردو ایوارڈ'' عطا کیا۔ کرنل غلام سرور نے ۲۱ دسمبر ۲۰۰۹ء کو وفات پائی۔

مسافر حرم

حج کہنے کو ایک عبادت ہے مگر دراصل اس میں ہر عبادت اور ہر عمل خیر کی روح موجود ہے۔ اس سفر میں پرہیز گاری اور تقویٰ کے ساتھ مسلسل خدا کی یاد اور خدا کی طرف شوق و عشق کی جو کیفیت آدمی پر گزرتی ہے، وہ اپنا ایک مستقل نقش دل پر چھوڑ جاتی ہے جس کا اثر برسوں قائم رہتا ہے۔ ''مسافر حرم'' کرنل غلام سرور کے سفرِ حج کی داستان ہے۔ مصنف ۲۰ ستمبر ۱۹۸۱ء کو حج کے لیے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ احرام باندھنے کے بعد اپنے محسوسات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''میں احرام باندھ چکا تو یوں محسوس ہوا جیسے میری کایا ہی پلٹ گئی ہو۔ ایسا لگا گویا دنیا ہی دوسری ہے ایک اہتزاز خون میں گردش کرنے لگا۔ ایک نشہ، ایک سرور، رگ و ریشہ میں دوڑ گیا۔ پھر مجھے معاً خیال آیا کہ احرام باندھنے سے پہلے امیر و غریب، خوشحال و مفلس، عالم و جاہل، حاکم و محکوم الگ الگ امتیازی طور پر نظر آتے ہیں مگر احرام باندھے کے بعد یہ امتیاز مٹ جاتا ہے۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر کوئی ''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ'' کی صدائیں بلند کرنے لگتا ہے۔''(۱۹)

مصنف کراچی سے جدہ تک کے ہوائی سفر کے دوران میں پیش آنے والے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جہاز میں سوار زائرین کی اکثریت دیہاتی مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھی۔ ان کے لیے کوئی سفر کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ بڑی بیبیاں خاصی سہمی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہی حال ''بڈھے بابوں'' کا تھا۔ اس وقت بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جب جہاز کا عملہ لنچ باکس لے کر ہر مسافر کے سامنے آتا ہے۔

> ''اس موقع پر بھی ہمارے ''اللہ لوگ'' بزرگوں سے بڑی دلچسپ حرکات سرزد ہوئیں۔ مسافروں کی غالب اکثریت، حیرت کی تصویر بنے، اللہ کی ان نعمتوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کھانے کے آداب غالباً کسی کو نہ آتے تھے۔ جہاز کے عملہ نے مسافروں کو اس پریشانی میں مبتلا دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا اور انھوں نے ''عملی تربیت' دینا شروع کر دی۔ جہاز میں ایک عجیب سماں بپا تھا۔ میرے پڑوس میں بیٹھی ہوئی ایک حاجن میری تقلید کیے جا رہی تھیں۔ میں چاول نہیں کھاتا۔ بڑی بی نے بھی چاولوں کو چھوا تک نہیں۔ جی میں آیا محترمہ سے پوچھوں۔ میرے چاول کھانے پر پابندی تو ڈاکٹر نے عائد کر رکھی ہے مگر آپ کو کس حکیم نے منع کر رکھا ہے؟ فیرنی کھاتے وقت بھی بڑے لطیفے سرزد ہوئے۔ ایک بزرگ، اپنی زبان سے فیرنی چاٹتے ہوئے پائے گئے۔ انہیں دیکھ کر جہاز کا عملہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔''(۲۰)

کرنل غلام سرور اس سفر نامہ میں بیت اللہ شریف، روضہ اطہر، مسجد نبوی اور حجاز مقدس کے تاریخی آثار، مشاہد، حرمین

الشریفین کے مختصر تاریخی حالات کے علاوہ اہم اور ضروری معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ مکہ میں قیام کے دوران مصنف اپنے بچوں کے نام جو تفصیلی خط لکھتے رہے ان کے جستہ جستہ حصے بھی اس سفر نامہ میں شامل ہیں۔ کل گیارہ خطوط کتاب میں شامل ہیں جن کا اسلوب نہایت خوب صورت ہے، حرم پاک کے بارے میں مصنف ایک خط میں لکھتے ہیں:

''رات کے وقت، نور کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ حرم پاک کے میناروں کا جلال، جھلمل جھلمل کرتی ہوئی روشنیوں کا حسن، پھر جذبہ ایمان سے سرشار زائرین کا ایمانی جوش وخروش یہ سب عوامل مل کر ایک عجیب وجدانی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ میں ان اوقات میں، دنیا و مافیہا سے لاتعلق ہو کر، کھلے آسمان پر نظریں گاڑ دیتا ہوں۔ یقین مانو مجھے یوں لگتا ہے جیسے فضائے بسیط سے نورانی پھوار کعبۃ اللہ کے آس پاس نور کا ہالہ بنا رہی ہے۔ آسمان پر رات کے وقت نہ چاند دکھائی دیتا ہے، نہ ستارے۔ گاہے گاہے، پرندوں کے غول حرم پاک کے اردگرد نظر آتے ہیں اور میں یوں محسوس کرنے لگتا ہوں جیسے آسمان سے، فرشتے نور کی شمعیں روشن کرنے اور فرزندانِ توحید کی جھولیاں ایمان و ایقان سے بھرنے، بیت اللہ کے آس پاس منڈلا رہے ہوں۔''(۲۱)

مکہ میں قیام کے دوران مصنف کی ملاقات جن لوگوں سے ہوتی ہے اُن کا ذکر بھی وہ بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ اس سفر نامہ کا اہم باب ''فلسفۂ حج پر ایک نظر'' ہے۔ غلام سرور اس باب میں حج کا اصل فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مناسک میں ایک ایک چیز بندگی کی ابھری ہوئی تصویر دکھائی دیتی ہے:

''اس سفر میں پرہیز گاری اور تقویٰ کے ساتھ مسلسل خدا کی یاد اور خدا کی طرف شوق وعشق کی جو کیفیت آدمی پر گزرتی ہے وہ اپنا ایک مستقل نقش دل پر چھوڑ دیتی ہے جس کا اثر برسوں قائم رہتا ہے۔ ان آیاتِ بینات اور ان آثارِ متبرکہ کو دیکھ کر ایک خدا پرست آدمی عزم وہمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جو سبق لے سکتا ہے شاید کسی دوسری چیز سے نہیں لے سکتا۔۔۔ مراسم حج کے پیچھے کام کرنے والی ان ساری حقیقتوں کو دیکھئے۔ بندگی رب کا کون سا جذبہ ہے جو اس کے اندر لہریں نہیں لے رہا ہے۔ خصوصاً جذبہ جہاد جو بندگی کی معراج کمال ہے وہ ان سارے اعمال میں اس طرح سمویا ہوا ہے کہ یہ پورا حج جہاد کی ایک بہت بڑی علامتی مشق نظر آنے لگتا ہے۔''(۲۲)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب سفر نامہ وہی ہوتا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس کرے کہ وہ خود بھی سفر نامہ نگار کے ساتھ اس سفر میں شریک ہے۔ کرنل غلام سرور نے تاریخی حوالوں کے ساتھ مقاماتِ مقدسہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اس سفر نامے میں وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ تاریخی معلومات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ مصنف کا انداز بیان انتہائی دلکش ہے اور ان کا رواں اسلوب بھی سفر نامے کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل سکندر خان بلوچ

لیفٹیننٹ کرنل سکندر خان بلوچ یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۵۷ء میں فوج کے میڈیکل کور میں بطور سپاہی بھرتی ہوئے۔ علمی و ادبی ذوق کے باعث فوج میں رہتے ہوئے میٹرک سے لے کر ایم اے انگریزی کا حصہ اول کر لیا۔ ۱۹۶۴ء میں میڈیکل کور چھوڑ کر پشاور یونیورسٹی سے باقاعدہ ایم اے انگریزی کیا اور ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک فوج کی ایجوکیشن کور میں کمیشن لیا۔ دوران ملازمت سابقہ مشرقی پاکستان اور شمالی علاقہ جات سمیت پاکستان کے تمام صوبوں میں خدمات انجام دیں۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول اور سعودی ملٹری اکیڈمی الریاض (سعودی عرب) میں بھی خصوصی تدریسی فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے۔

سولجر نامہ

''سولجر نامہ''، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خان بلوچ کا بطور ایک فوجی افسر کے دلچسپ تجربات و مشاہدات پر مبنی سفر نامہ ہے۔ اس میں مصنف نے سعودی عرب، دمشق اور استنبول ترکی کے مقامات کا ذکر کیا ہے۔ ابتدائی تین ابواب ''زندگی کا ایک اہم موڑ''، ''انتظار کی سول'' اور ''فائل کا سفر'' روانگی کے مراحل پر مشتمل ہیں۔ سکندر خان بلوچ کی پوسٹنگ ۱۹۷۳ء میں جہلم میں ہو جاتی ہے۔ اس تاریخی اہمیت کے حامل شہر کے بارے میں مصنف ''زندگی کا ایک اہم موڑ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> ''جہلم پنجاب کا خوبصورت علاقہ ہے۔ دریا کے کنارے جہلم شہر ایک درمیانے درجے کا شہر ہے لیکن بہت زیادہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان کے تمام حملہ آور اسی راستے سے گزرے ہیں۔ اسی جگہ دریائے جہلم کے کنارے سکندر اعظم اور راجہ پورس کی فوجیں آپس میں ٹکرائیں۔ گکھڑوں کی بھی کئی ایک جنگیں ہوئیں۔ ہیر رانجھا کا مشہور کردار رانجھا بھی کان چھیدوا کر اسی علاقہ میں ٹلا جوگیاں کے مقام پر چلہ کاٹنے آیا۔ چھوٹے بڑے تاریخی اہمیت کے بھی بہت سے مقامات ہیں۔'' (۲۳)

مصنف جہلم کے علاقے سے منسوب کئی دلچسپ قصوں کو بھی اس باب میں بیان کرتے ہیں۔ دریائے جہلم کے حوالے سے مصنف ایک خوب صورت منظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''جہلم شہر بڑے شہروں میں شمار نہیں ہوتا لیکن ضروریات زندگی کی ہر سہولت موجود ہے۔ دریا کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے ایک بہترین سیر گاہ اور خوب صورت تفریحی مقام تصور ہوتا ہے۔ چاندنی راتوں میں جب عمارات کا عکس دریائے جہلم کے پانی پر پڑتا ہے تو یہ نظارہ اہلِ ادب حضرات خصوصاً شاعروں اور آرٹسٹوں کے لیے روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ جتنا دیکھیں دل نہیں بھرتا خاص کر گرمیوں کے موسم میں جب ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ موسم بھی خوشگوار ہو تو وہاں سے ہلنے کو دل نہیں چاہتا۔ شام کو دریا کے کنارے سیر کرتی ہوئی نوجوانوں کی ٹولیاں، بوڑھے اور ریٹائرڈ فوجیوں کے خوش گپیوں میں مشغول

گروپ، بلند قہقہے ایک خوب صورت اور پر جوش زندگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ دریا کے کنارے فوجی گاف کورس اس کھیل کو مزید خوبصورت اور خوش کن بنا دیتا ہے۔'' (۲۴)

مصنف اسی باب میں اپنی سعودی عرب روانگی کے احکامات موصول ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ انٹرویو کے مرحلے سے گزرنے اور انتخاب کے بعد سکندر خان بلوچ کو عربی زبان کا ایک کورس کرایا جاتا ہے۔ انہیں اپنے خاندان کو بھی ہمراہ لے جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ کتاب میں ''فوجی زندگی کی اندرونی کہانی'' کے عنوان سے مصنف ہمیں فوجی زندگی کے بعض پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

'' تنگ دستی کے باوجود فوج کی زندگی شاہانہ ہے۔ گو مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہوتی لیکن معاشرتی مقام ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے تعلیم کی سہولتیں اور سب سے بڑھ کر فوجی تربیت ایک عام لڑکے کو بھی اچھے انسان میں ڈھال دیتی ہے اور یہ تربیت ساری عمر جاری رہتی ہے۔ جیسے جیسے انسان رینک میں بڑھتا جاتا ہے مالی تنگدستی بھی کم ہو جاتی ہے کئی ان دیکھے فوائد سے زندگی کی خوشیاں بحال رہتی ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک صاف ستھری مجاہدانہ زندگی ہے۔ فوج کا باہمی بھائی چارہ، آپس کا اعتماد، پرخلوص قہقہے، باہمی عزت واحترام اور کرپشن سے پاک زندگی، شریفانہ اور محفوظ ماحول، تنگدستی کے باوجود زندگی کی رنگینی، زندگی کا حسن اور زندگی کی خوشیاں برقرار رہتی ہیں۔ اگر مجھے دوبارہ زندگی ملے تو پھر بھی میں فوج میں ہی جانا چاہوں گا۔'' (۲۵)

مصنف ۱۲ جون ۱۹۷۵ء کو اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ ریاض پہنچ کر کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ انہیں کوئی لینے کو نہیں آیا ہوتا۔ ایئر پورٹ پر ہر جگہ ٹھنڈے مشروبات دستیاب تھے مگر انہیں چائے کی شدید طلب ہوتی ہے۔ سعودی قہوہ پینے کے بعد اپنے محسوسات کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''پہلا گھونٹ پیا تو ایسے لگا جیسے چینی ملا تیزاب منہ میں ڈال لیا ہو۔ جیسے جیسے حلق سے نیچے گیا معدے تک جلن ہونے لگی۔۔۔ شکر تو یہ کہ ان گلاسوں کا سائز چھوٹا بلکہ بہت ہی چھوٹا تھا اور اگر خدانخواستہ پاکستانی گلاس ہوتے تو ایئر پورٹ سے سیدھے ہسپتال پہنچا دیئے جاتے۔'' (۲۶)

سعودی عرب میں، مصنف تین سال گزارتے ہیں۔ اس دوران میں انہیں بے شمار تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ سعودیہ میں مقیم پاکستانیوں کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہاں جو سب سے کڑوا اور تلخ تجربہ ہوا وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کا رویہ تھا۔ مطلب پرستی اور حسد تو شاید ان کی فطرت میں ہے۔ کچھ تجربہ تو ہمیں ایئر پورٹ پر ہی ہو گیا تھا اور اب جیسے جیسے واقفیت زیادہ ہوئی تلخی بڑھتی ہی گئی۔ وہاں دنیا کی مختلف قوموں، مختلف گروہوں اور مختلف انسانوں سے واسطہ پڑا لیکن جو زخم اپنے لوگوں کے ہاتھوں لگے وہ غیروں کی سوچ

سے بھی باہر تھے۔'' (۲۷)

مصنف ہمیں سعودی عرب کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے واقف کراتے ہیں۔مثلاً سعودی قانون کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سعودی قانون بڑا سخت ہے کسی نوجوان کو اسلحہ حتیٰ کہ چاقو تک ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں اور نہ کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔اگر ایسا کوئی کرتا بھی ہے تو فوری پکڑا جاتا ہے اور موجب سزا ہوتا ہے۔ہم نے اپنے تین سالہ قیام کے دوران کسی بھی شخص کو سعودی یا غیر سعودی سے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔سعودی عرب میں جہاں چاہیں پھریں۔دن ہو یا رات ہو کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں ہے۔'' (۲۸)

امن وامان کے حوالے سے مصنف بہت مطمئن رہے۔ان کا کہنا ہے:

''امن امان کا یہ عالم ہے کہ ہم غیر ملکی لوگ اپنا گھر بند کر کے گاڑیاں گھر کے سامنے کھڑی کر کے دو دو ماہ کے لیے پاکستان آ جاتے۔دو دو ماہ بعد جب واپس جاتے تو گاڑی پر کئی کئی انچ مٹی ہوتی لیکن گاڑیاں اور گھر سلامت ملتے۔۔۔ہم لوگ اکثر رات کو الریاض سے مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ تک کا لمبا سفر کرتے۔ایک دو مقامات کے سوا سارا علاقہ صحرا تھا۔رات کو ہم جہاں تھک جاتے، گاڑی سڑک سے علیحدہ پارک کرتے۔چٹائیاں نکال کر صحرا میں سو جاتے۔گاڑیاں کھلی کھڑی رہتیں لیکن سلام ہے سعودی نظام کو کہ کبھی نقصان نہیں ہوا اور نہ کبھی کوئی خطرہ محسوس ہوا۔اتنی پرسکون زندگی اور اتنا اچھا امن وامان صرف انسانی ذہن میں یا افسانوں میں ہوسکتا ہے، دنیا میں کبھی ممکن نہیں۔اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔'' (۲۹)

سعودی کھانوں کا ذکر بھی کتاب میں شامل ہے۔''کھاؤ پیئو اور عیش کرو'' کے عنوان سے مصنف سعودی کھانوں سے متعارف کراتے ہیں۔ان کا کہنا ہے:

''باقی کھانے تو تقریباً ہمارے جیسے ہی تھے سوائے پکانے کی ترکیب کے کئی قسم کے نان، روٹیاں، پراٹھے ملتے۔چاول، مرغی معمول کی غذا تھی لیکن دو چیزوں کا ذکر بہت ضروری ہے۔وہ یہ کہ بڑی تقریبات میں سعودی اکثر سالم بکرا پکاتے بلکہ ابالتے اور جب اچھی طرح گل جاتا، سالم نکال کر اس کے چار حصے کر کے چاولوں کے بہت بڑے تھال میں اوپر رکھ دیتے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ بکرے کا سر اور آنکھیں سلامت رہیں اور مہمان خصوصی کے سامنے ہوں۔'' (۳۰)

سکندر خان بلوچ سعودی عرب میں تین سال رہے۔دو سال گزرنے کے بعد وہ جدہ سے دمشق اور یورپ کی سیر کا پروگرام بناتے ہیں اور روانہ ہو جاتے ہیں۔وہ دمشق شہر کو دیکھ کر مایوس ہوتے ہیں:

''دمشق کے متعلق ذہن میں بڑے بڑے خیالات تھے۔ بچپن دمشق اور یہاں کے خلفاء کا ذکر پڑھ کر بڑے مرعوب ہوا کرتے تھے۔ جب شہر میں داخل ہونے لگے تو سارے قلعے مسمار ہوتے نظر آئے۔ ڈرائیور سے پوچھ ہی لیا کہ بھائی اصل شہر کب شروع ہوگا؟ بڑا تیز سا جواب ملا، یہ شہر نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ سن کر دھچکا سا لگا کہ اس کی حالت پنجاب کے ایک عام شہر سے زیادہ نہ تھی۔ لاہور، کراچی اور پنڈی والی کوئی بات نظر نہ آئی۔''(۳۱)

مصنف نے سعودی عرب کے مختلف مقامات کا ذکر نہیں کیا، صرف وہاں کی معاشرت کو تفصیل سے بیان کیا ہے البتہ دمشق کے مختلف مقامات سے وہ ہمیں متعارف کرواتے ہیں۔ مثلاً دمشق کے قبرستانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہاں کا سب سے بڑا اور مشہور قبرستان باب الصغیر ہے۔ اس قبرستان میں سیدہ ام حبیبہؓ، السیدہ اُم سلمیٰؓ (ازواجِ مطہرات) سیدہ فضہؓ، سیدنا محمدؓ، السید بلالؓ حبشی مؤذن، حضورؐ، سیدنا عبداللہ بن جعفر طیارؓ، زوجہ جعفر طیارؓ، سیدنا زینب الصغریٰ بنت حسینؓ، سیدنا محمد بن ابو بکر صدیقؓ، سیدنا عبداللہ بن امام زین العابدین اور بہت سی عظیم المرتبت ہستیاں مدفون ہیں۔ اسی قبرستان کے ساتھ ایک اور قبرستان ہے جہاں شہدائے کربلا کے سر مبارک دفن ہیں۔ روایت کے مطابق سانحہ کربلا کے بعد یزید نے ان صحابہ اکرام کے سر مبارک عراق سے لا کر یہاں دمشق میں دفن کیے تھے۔''(۳۲)

دمشق کے بعد مصنف استنبول روانہ ہوتے ہیں اور وہاں کے خوب صورت مقامات کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ان مقامات میں استنبول کا مشہور میوزیم ٹاپ کاپی سر فہرست ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ میوزیم دنیا کا خوب صورت اور شاندار میوزیم ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سکندر خان بلوچ کے اس سفر نامے کا انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔ زبان صاف اور عام فہم ہے۔ اس سفر نامے کے ذریعے نہ صرف ہم خوب صورت مقامات کی سیر کرتے ہیں بلکہ سعودی اور ترکی معاشرت کے حوالے سے بھی ہم بہت کچھ جاننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید ۲۱ مئی ۱۹۱۲ء کو لاہور (اندرون بھاٹی گیٹ) میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک سنٹرل ماڈل سکول، لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۱ء میں انڈین میڈیکل سروس میں بطور لیفٹیننٹ شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۴ء میں میجر اور ۱۹۴۶ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۹۴۷ء میں برما کی آزادی کے بعد وہاں کے فوجی ہسپتالوں کی تنظیم نو کے لیے بھیجے گئے۔ وہاں دو سال تک اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں وطن واپس آ گئے۔ ۱۹۵۱ء میں تہران میں ایران و عراق کے لیے پاکستانی سفارت خانہ میں ملٹری اتاشی مقرر ہوئے۔ پانچ سال بحیثیت ملٹری اتاشی کام کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے رائل میڈیکل کالج، لندن روانہ ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں پاکستان میڈیکل ریسرچ کونسل کے ڈائریکٹر بنے۔ ۱۹۶۶ء میں رائل کالج آف فزیشنز کے ممبر

بنے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک میو ہسپتال لاہور میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۳ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۳ء تک دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کی مجلس انتظامیہ کے ممبر اور بعد میں چیئرمین کی حیثیت سے منسلک رہے۔ اسی عرصہ کے دوران میں وہ لاہور میوزیم کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر بھی رہے۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور اور لاہور میوزیم کے ساتھ وہ آخری دم تک منسلک رہے۔ خواجہ عبدالرشید نے ۱۳ مارچ ۱۹۸۳ء کو وفات پائی۔

سیر فرنگ

یہ سفر نامہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو خواجہ عبدالرشید نے مختلف یورپی ممالک کے قیام کے دوران میں لکھے۔ یہ خطوط انھوں نے وقتاً فوقتاً عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں بھیجے۔ انھوں نے یہ خطوط ہفتہ وار ''صدق جدید'' میں شائع کیے۔ اس کے بعد انہیں ''سیر فرنگ'' کے عنوان سے ترتیب دے دیا گیا۔ خواجہ عبدالرشید ''سیر فرنگ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں اکثر ایسا کرتا تھا کہ جب کوئی مقام دیکھ کر آتا یا کسی عجائب گھر یا کتب خانہ کو دیکھا تو ساتھ ساتھ نوٹ لیتا جاتا تھا اور واپس آ کر ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر خط لکھ دیتا۔ بعض وفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر خط لکھ دیا۔ جب بھی کوئی خیال ذہن میں ابھرا میں نے خیالات کو بیان کرنے سے گریز نہ کیا۔'' (۳۳)

مصنف سفرِ یورپ کے دوران میں لوگوں کے معمولات زندگی کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے ہاں نظم وضبط ہر شعبے میں موجود ہے۔ مصنف ان لوگوں کی شادی بیاہ کی تقریبات کا موازنہ اپنے ملک کی رسومات سے کرتے ہیں:

> ''کیا ہم لوگوں کی زندگی کی قدریں بالکل لایعنی نہیں ہیں؟ جس مہمان نوازی اور تواضع کا سبق ہم کو بچپن سے دیا گیا تھا وہ یہاں پر قطعاً ناممکن ہے۔ آج اگر ہم لوگوں کو اپنا کام خود کرنا پڑ جائے تو یہ مہمان نوازیاں ختم ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز مہمان نواز نظر نہیں آتا اور انگریز قوم میں اسراف قطعاً ناپید ہے۔ اسراف مسلمانوں کی طبیعت ثانیہ ہے۔ شادی بیاہوں پر جو اسراف ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ ایک اوسط درجے کے مسلمان کی زندگی میں بھی بے حد اسراف ہے اور یہ خصلت ہماری تباہی کا باعث ہوئی ہے۔'' (۳۴)

اس اصلاحی جذبے کے باعث بعض اوقات مصنف کا انداز ناصحانہ ہو جاتا ہے۔ مصنف کا جذبہ جستجو بھی انہیں ہر جگہ بے قرار رکھتا ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں عجائب گھر کی سیر، نوادرات و کتب کی خریداری نہیں بھولتے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ وہاں کے لوگ نوادرات عجائب گھروں کو دے دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''یہاں ایک عجیب رواج دیکھا ہے اور وہ یہ کہ عجائب گھروں کے آس پاس تمام کتب فروش و انطیق فروش جمع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں جب کبھی کسی میوزیم کو دیکھ کر نکلتا ہوں تو اکثر یہ سڑک پر بکھرے موتی بھی دیکھ لیتا ہوں اور کبھی کبھار کچھ ان میں سے چن لیتا ہوں۔'' (۳۵)

عبدالرشید عمارات کو دیکھ کر، ان کے تاریخی پس منظر اور معماری پر غور کرتے ہیں۔ ان عمارات میں موجود نوادرات،

فنون لطیفہ اور خصوصاً خطاطی کے نمونوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً:

''اب چلیے خطاطی کے طبقہ میں، یہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ تھا۔ خطاطی کے کتبے، کتابیں، جلدیں، لکھنے کا سامان۔ یہاں تک کے خطاط کے قلم و دوات بمع اس کے نام کے نمائش کیے گئے تھے مگر سب نمونے ترکی خطاطی اور جلد سازی کے تھے۔ نہ ایرانی، نہ ہندی اور خطوط بھی اس قسم کے منیر علی تبریزی اور سلطان علی مشہدی کو مات کر جائیں۔''(۳۶)

خواجہ عبدالرشید ہر اس چیز کے متعلق قارئین کو معلومات فراہم کرتے ہیں جو ان کے نزدیک نئی اور دلچسپ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں عجائب گھر بچوں کی تعلیم میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''عجائب گھر بڑے عمدہ ہیں اور قوم کو عجائبات دیکھنے کا شوق ہے۔ بچوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ عجائب گھر بچوں کی تعلیم اور تربیت میں عجیب پارٹ ادا کر رہے ہیں، کیا عرض کروں آپ عجائب گھر کے کسی حصہ میں ہوں، کچھ سمجھ نہ آ رہا ہو، وہاں ہی ٹیلی فون لگے ہیں، اٹھایئے اور کان سے لگایئے، لیکچر ہو رہا ہوگا، آپ جتنی دیر چاہیے سنتے جایئے تاوقتیکہ مشکل حل نہ ہو جائے۔ یہاں ٹیلی وژن بھی چل رہے ہیں اور ہر چیز سمجھائی جا رہی ہے۔ گویا قوم کی تربیت عجائب گھروں میں ہو رہی ہے۔''(۳۷)

''سیر فرنگ'' میں ہمیں کامیاب منظر کشی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ سفر نامہ کی تکنیک میں یہ عنصر اہم حیثیت رکھتا ہے۔ منظر نگاری کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

''آفتاب ابھی ابھی طلوع ہوا ہے۔ میرے کمرے سے اس وقت ایک پرسکون سمندر جھیل کی طرح چھایا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ ملک جھیلوں کا ملک ہے۔ درحقیقت سمندر کٹ کٹ کر زمین کے اندر اس طرح آ گیا ہے جیسے جھیلیں ہوتی ہیں۔ جب آسمان ابر آلود ہوتا ہے تو سمندر بھی گدلا دکھائی دیتا ہے مگر جب بادل چھٹ جاتے ہیں اور آسمان اپنی نیلی چھتری کھول دیتا ہے تو سمندر بھی نیلگوں لبادہ پہن لیتا ہے۔''(۳۸)

خواجہ عبدالرشید ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے بیان پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ''سیر فرنگ'' میں سے ایک اقتباس دیکھیے:

''بروک لینڈ کا قبرستان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے ایک کونے میں مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ یہ بہت بڑا قبرستان ہے مگر اس طرح ترتیب دیا گیا کہ لاہور کا شالا مار باغ بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ حیف کہ مسلمانوں کا حصہ ابھی تک بنجر ہے۔ کسی کو درخت لگانے تک کا خیال نہیں آیا۔ ساتھ پارسیوں کا قبرستان ہے مگر کیا عمدہ بنا رکھا ہے۔ انگریز قبر پرستی نہیں کرتا مگر بنا سنوار کر رکھنے کا بڑا اہتمام کرتا ہے۔ یہ خاصہ اس کی زندگی کے ہر گوشہ میں نمایاں ہے۔''(۳۹)

الغرض یہ سفر نامہ گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ خواجہ عبدالرشید نے زبان سادہ وسلیس اور عام فہم استعمال کی ہے۔ انہوں نے اس سفر نامے کے ذریعے قارئین کو بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ سفر نامہ اپنے اندر دلچسپی کے عناصر بھی رکھتا ہے، خاص طور پر جب وہ تاریخی وجغرافیائی تفصیلات فراہم کرتے ہیں تو قاری کے اندر جذبۂ جستجو بیدار ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ سفر نامہ ایک خوب صورت تحریر ہے۔ محمد عبدالرشید قاسمی ناظم کتب خانہ شانِ اسلام کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''بہت سے سفر نامے نظر سے گزرے ہیں لیکن جو ایمانی روح اور اسلامی حرارت اس سفر نامے میں محسوس ہوتی ہے وہ دوسرے عام سفر ناموں میں مقصود ہے۔ اسلامی اصول کی فلاسفی کے علاوہ یورپی اقوام کی موجودہ معاشرتی زندگی کا بے لاگ تجزیہ جو آپ نے کیا ہے آپ ہی کا حصہ ہے۔ متمدن قوموں کی علمی، تہذیبی اور اخلاقی حالت نیز ان کے بے راہروی، مادر پدر آزادی کی ہو بہو تصویریں کھینچ دی ہیں بلکہ سچ پوچھیں تو یہ سفر نامہ قُلْ سِیْرُوا فِی الارضِ کی عملی تفسیر ہے اور فاضل محقق نے ایمانی جذبات واحساسات میں ڈوب کر یہ سفر نامہ لکھا ہے۔''(۴۰)

جنرل شفیق الرحمٰن

جنرل شفیق الرحمٰن کا شمار اُردو ادب کے مقبول ترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ۹ نومبر ۱۹۲۰ء کو مشرقی پنجاب کے ضلع روہتک کے ایک قصبے کلانور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ بعد ازاں کلانور ہی کے ایک سکول میں داخل کروادیے گئے۔ شفیق الرحمٰن نے میٹرک کا امتحان سٹیٹ ہائی سکول، بہاول نگر سے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج، روہتک سے ایف ایس سی (میڈیکل) کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال انھوں نے انڈین میڈیکل سروس میں شمولیت اختیار کر لی۔ دوران ملازمت بہت سے سفر اختیار کیے۔ دوسری جنگ عظیم کے مختلف محاذوں پر طبی خدمات سرانجام دیں۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی خدمات پاکستان آرمی میڈیکل کور کو تفویض ہو گئیں۔ جنگ عظیم دوم کے تجربات کے پیش نظر قبل ازیں انہیں آزاد کشمیر کے محاذ پر اور ۱۹۶۵ء میں چونڈہ کے اہم ترین محاذ پر خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شفیق الرحمٰن کی خدمات بحری فوج کے سپرد کر دی گئیں جہاں وہ ڈائریکٹر میڈیکل سروسز کے عہدے پر تعینات رہے۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں پاک بحریہ ہی سے سرجن ریئر ایڈمرل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی سینتیس سالہ فوجی ملازمت کا سفر اختتام کو پہنچا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد شفیق الرحمٰن کی ادبی خدمات کی وجہ سے انہیں اکادمی ادبیات کا چیرمین منتخب کیا گیا۔ وہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۰ء میں اس ادارے سے وابستہ ہوئے اور ۹ دسمبر ۱۹۸۶ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ شفیق الرحمٰن نے ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء کو اسلام آباد میں وفات پائی۔

دجلہ

اس سفر نامہ میں شفیق الرحمٰن نے مصر، یورپ اور عراق کے سفر کا حال لکھا ہے۔ یہ سفر نامہ چار عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے جن میں نیل، دھند، ڈینیوب اور دجلہ شامل ہیں۔ دجلہ کے موضوعات کے حوالے سے ارشد نعیم لکھتے ہیں:

''جہاں تک ''دجلہ'' کے موضوعات کا سوال ہے تو ان میں زندگی کی ہمہ گیریت اور رنگا رنگی موجود ہے۔ زندگی ان میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ ''دجلہ'' میں قدیم مصری تہذیب، دریائے نیل، دریائے ڈینیوب اور دریائے دجلہ کی تاریخ اور پس منظر کو بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنی سیاحت کے دوران اپنے باطن کے اندر بھی اتر جاتا ہے اور یہ باطنی سیاحت اور اس کے سفر نامہ میں ایک قسم کی رومانیت بھر دیتی ہے جو بڑی دلکش اور رنگین ہے۔'' (۴۱)

''دھند' کا منظر نامہ ایک پہاڑی مقام ہے جہاں شفیق الرحمٰن کچھ عرصہ تعینات رہے۔ بقیہ تین تحریریں نیل، ڈینیوب اور دجلہ جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے کہ مصر، جرمنی اور عراق کے سرزمینوں اور تہذیبوں کے مرقعے ہیں۔

''نیل'' میں شفیق الرحمٰن بطور سیاح اور مزاح نگار، دونوں حیثیتوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ ہمیں تاریخی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً:

''ایک طرف ممفس اور سقرہ کے اہرام ہیں پھر فسطاط نظر آتا ہے جہاں فاتح مصر عمرو بن العاص کی مسجد ہے۔ بائیں کو ہٹ کر قاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک اونچے ٹیلے پر سلطان صلاح الدین ایوبی کا قلعہ ہے اور محمد علی کی مسجد (جو ۱۹۵۷ء میں مکمل ہوئی، ہمارے طلبہ کو کم از کم سنۂ ہمیشہ یاد رہتا ہے) وہیں چاہ یوسفؑ بھی ہے جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت یوسفؑ کو قید کیا گیا تھا۔ قریب ہی زلیخا کے روایتی محل کے نشانات ہیں۔ پرانے شہر میں بے شمار تاریخی مسجدیں ہیں جنہیں جامعہ کہا جاتا ہے۔ سادہ اور پرشکوہ جامعہ ابن طولون ہزار سال پرانی مسجد ہے اور جامعہ از ہر ہزار برس پرانی یونیوسٹی اک طرف مملوک حکمرانوں کے مقبروں کے پیاز نما گنبد نظر آتے ہیں۔'' (۴۲)

دوسری طرف مزاح نگار کی حیثیت سے اس طرح کی گفتگو کرتے ہیں:

''وہ اپنی منگیتر کو انگوٹھی پہنا کر محاذ پر آیا تھا۔ جنگ کے چند سال بعد جب اڈنبرا میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا کہ اتنے دبلے پتلے نابی کی بیوی بے حد موٹی تھی۔ شاید وہ بھانپ گیا اور اس نے علیحدگی میں مجھے بتایا کہ جب تک یہ منگیتر رہی بالکل چھریری تھی۔ پھر شادی کے قریب آئی تو یک لخت موٹی ہو گئی۔ میں نے اسے چھیڑا کہ شادی سے پہلے اس نے جتن تو کیے ہوں گے کہ اس پلی ہوئی لڑکی سے منگنی ٹوٹ جائے لیکن وہ اتنی موٹی تازی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی نہ اتار سکا ہوگا۔ آخر سکاٹسمین تھا اور انگوٹھی پر پورے دس پونڈ خرچ کر چکا تھا، لہٰذا۔۔۔ زرمی خورم کے سلسلے میں مجبوراً شادی کرنی پڑی ہوگی۔'' (۴۳)

شفیق الرحمٰن نے اس سفر نامے میں زیادہ تر الفاظ اور واقعات کے بیان سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سفر کے دوران میں جہاں وہ مختلف خوب صورت مناظر کی جستجو میں رہتے ہیں، وہاں مختلف شگفتہ واقعات بھی تلاش کرتے ہیں اور ان

کی مدد سے اپنی تحریر کو مؤثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شفیق الرحمٰن کا سفر نامہ ''دجلہ'' مصر، جرمنی اور عراق کے سفر کی روداد ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف کرداروں کے ذریعے جہاں اپنے سفر کو نقوش کو اجاگر کیا ہے وہاں دریائے دجلہ کے کنارے عروج و زوال سے گزرنے والی تہذیبوں کی کہانی کو بھی بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ سفر نامہ اپنے شگفتہ اسلوب اور منفرد زاویہ نظر کے باعث جدید سفر نامے کے تناظر میں خاصی اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔

کیپٹن ڈاکٹر غلام سرور شیخ

کیپٹن ڈاکٹر غلام سرور شیخ ۱۹۵۳ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ جناح کالونی فیصل آباد سے پرائمری کا امتحان پاس کیا اور ایم سی ہائی سکول کوتوالی روڈ، فیصل آباد سے میٹرک کیا۔ ایف ایس سی گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کی اور ایم بی بی ایس کی ڈگری کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے حاصل کی۔ ۱۹۷۹ء میں پاک فوج میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۸۲ء تک بطور کیپٹن ڈاکٹر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر غلام سرور کا علمی ذوق بڑا بلند ہے۔ قلم و قرطاس سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں فرد کی اصلاح اور معاشرے کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کے پہلو نمایاں ہیں۔

تکمیل آرزو

''تکمیل آرزو'' ڈاکٹر غلام سرور شیخ کا سفر نامہ حج ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ ایک سچے مسلمان کی واردات قلب ہے جو میڈیکل سائنس کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکٹر غلام سرور شیخ نے مقامات مقدسہ کے بیالیس روزہ مقدس اور متبرک سفر کی داستان بیالیس روز ہی میں مکمل کی ہے جو بذات خود بہت بڑا اعزاز ہے۔ ڈاکٹر غلام سرور شیخ نے انتہائی سادہ اور پُرخلوص زبان میں نہایت سلاست، روانی اور شائستگی سے اپنی قلبی و باطنی کیفیات کو خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریر دل سے نکلتی ہے اور دل ہی میں اترتی چلی جاتی ہے انھوں نے کسی بھی مقام پر تکلف، تصنع، بناوٹ اور انشاء پردازی کا سہارا نہیں لیا، ہر بات سیدھے سادے انداز میں بیان کر دی ہے۔ مصنف نے حج اور زیارت کے مراحل درجہ بدرجہ ترتیب وار بیان کیے ہیں۔ انھوں نے انتہائی خاص موقعوں پر مانگی جانے والی دعائیں بھی پوری تفصیل سے کتاب میں شامل کی ہیں۔ غلام سرور شیخ نے اپنے ہمراہ جانے والے تمام احباب کے مصروفیات اور اپنے ہم سفروں کی کیفیات بھی بیان کی ہیں۔ مصنف کا مشاہدہ اور تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے خانہ کعبہ کے صحن، برآمدے، ہر ستون کی ساخت، فن تعمیر، ظاہری شان و شوکت اور ان کی تعمیر کی تاریخی ادوار بھی بیان کیے ہیں۔ مسجد نبویؐ کا ذکر بھی بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ اس سفر نامہ کے بارے میں ریاض احمد قادری لکھتے ہیں:

> ''بارگاہ رسالت مآب میں ان کا دل عشق مصطفیٰ ﷺ، عقیدت رسولؐ محبت دو جہاں سے ایسا سرشار ہے کہ لفظ بھی عشق و عقیدت کے سانچے میں ڈھل ڈھل کر آ رہے ہیں۔ ان کے قلم نے مشک و عنبر اور عرق گلاب سے وضو کیا ہوا ہے۔ ان کا قلم یہاں قدم قدم پر سجدے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر غلام سرور شیخ نے اپنی دلی کیفیات واردات قلبی اور کیفیات جان بڑے ہی سحر انگیز پیرائے میں بیان کی ہیں۔ احتیاط کا دامن تھامے رکھا ہے ادب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے احترام کے جذبات کو ساتھ رکھا ہے اور کسی بھی جگہ پر افراط و تفریط

سے کام نہیں لیا ہے۔'' (۴۴)

یہ سفر نامہ دیارِ طیبہ جانے والوں کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر غلام سرور شیخ نے تمام مقامات کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس مقام پر پڑھی جانے والی دعاؤں کو بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ مصنف نے ارضِ مقدس پر موجود موٹروے کے جال، ہر شہر کے درمیان ٹریفک اور سفر کا احوال، وہاں کے ہوٹلوں، بازاروں کا احوال، فنِ تعمیر، تاریخ عرب، تاریخ اسلام، حج کے دوران پیش آنے والے اہم مسائل اور ان کا حل، غرض ہر چیز کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر اور اسلوب عام فہم ہے۔ بحیثیت مجموعی ''تکمیل آرزو'' ایک خوب صورت اور معلوماتی سفر نامہ ہے۔

میجر سید ضمیر جعفری

میجر سید ضمیر جعفری یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو ضلع جہلم کے ایک گاؤں چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مدرسے اور سکول سے حاصل کی۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول، جہلم سے پائی۔ گورنمنٹ کالج، کیمبل پور (اٹک) سے ایف اے کیا اور بی اے کی ڈگری اسلامیہ کالج، لاہور سے حاصل کی۔ سید ضمیر جعفری نے ۱۹۳۹ء میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور مولانا چراغ حسن حسرت کے اخبار ''شیرازہ'' میں بطور مدیر معاون کام کرنے لگے۔ بعد ازاں روزنامہ ''احسان'' کے مدیر معاون مقرر ہوئے۔ اس کے بعد رسالہ ''سدا بہار'' کے مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے لیکن رسالے کے مالکان سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے پر یہ ملازمت چھوڑ دی۔ ۱۹۴۴ء میں فوج کے تعلقاتِ عامہ کے شعبہ میں تعینات ہوئے۔ اسی دور میں سید ضمیر جعفری نے فوج میں کمیشن حاصل کر لیا اور کپتان کی حیثیت سے دوسری جنگِ عظیم میں جنوب مشرقی ایشیاء میں مختلف محاذوں پر قلم اور تلوار کے جوہر ایک ساتھ دکھاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں وطن واپس آ گئے۔ کپتانی کی وردی اتار کر صحافت کا لبادہ اوڑھا اور راولپنڈی سے روزنامہ ''بادشمال'' کا اجراء کیا۔ بعد ازاں دوبارہ فوج میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شرکت کی جس کے بعد میجر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ سید ضمیر جعفری اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے کے شعبہ تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر رہے۔ بعد ازاں وہ اکادمی ادبیات سے بھی وابستہ رہے۔ سید ضمیر جعفری کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر انھیں ہمایوں گولڈ میڈل (۱۹۳۸ء) تمغۂ قائداعظم (۱۹۶۷ء) اور صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی (۱۹۸۵ء) سے نوازا گیا۔ اردو ادب خصوصاً مزاحیہ شاعری میں ضمیر جعفری کو ''ادبی پیر و مرشد'' کا درجہ حاصل ہے لیکن ان کا سنجیدہ کلام بھی اعلیٰ پائے کا ہے۔ انھوں نے بے شمار موضوعات کو نظم و نثر میں قلمبند کیا ہے۔ سید ضمیر جعفری نے ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء کو وفات پائی۔

''سورج میرے پیچھے''

ضمیر جعفری کا یہ ایک سفر نامہ ہے اور مصنف کے مزاحیہ اسلوب نے اس سفر نامے کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔ اس کتاب میں پہلا سفر حرمین شریفین کا ہے جسے انھوں نے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر ۱۹۷۹ء میں اختیار کیا۔ دوسرا باب مصنف کے برطانیہ میں گزارے شب و روز کے تذکرے پر مبنی ہے جس میں ان کے ۱۹۷۹ء اور ۱۹۹۱ء کے دو سفروں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس باب میں سید ضمیر جعفری کے دوست احباب کا بہت زیادہ تذکرہ موجود ہے چونکہ ان کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا لہٰذا وہ ہر جگہ احباب کا تفصیلی تعارف کروانا نہیں بھولتے۔ بعض دلچسپ واقعات اور کرداروں کے شگفتہ تذکرے نے کہیں کہیں

خوشگوار کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مثال کے طور پر مانچسٹر میں جلسہ کرنے جانے والے ایک مولوی صاحب کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''مولوی صاحب نے جیب سے نکال کر ایک کاغذ ہمیں دیا جو مانچسٹر میں ان کے ایک جلسے کا اشتہار تھا۔ ان کے اسم گرامی کے ساتھ 'شہباز خطابت' کا لقب رقم تھا۔ وہ شاید کچھ اور بھی ارشاد فرماتے کہ ایک ٹائیلٹ کا دروازہ کھل گیا اور شہباز خطابت اڑ کر اس میں داخل ہو گئے۔'' (۴۵)

تیسرے باب میں امریکہ کے سفر کا حال بیان ہوا ہے۔ چوتھا اور آخری سفر بھارت کا ہے جہاں وہ ۱۹۸۵ء میں منعقد ہونے والی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے عطاء الحق قاسمی کے ہمراہ گئے تھے۔ اس حصے میں وہ اکثر ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کی ملازمت کے ابتدائی چند سال انہی علاقوں میں بسر ہوئے تھے۔ انہی یادوں کو تازہ کرتے کرتے وہ تبصرے بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اتنا جالندھر تو ہم یہاں چھوڑ کر نہیں گئے تھے جتنا اس وقت ریلوے سٹیشن پر موجود تھا۔'' (۴۶)

مختصر یہ کہ سید ضمیر جعفری نے ان تمام سفری یادوں کو شگفتہ اسلوب میں تحریر کیا ہے جس کی وجہ سے عام قاری کی دلچسپی اس کتاب میں بڑھ گئی ہے۔

سکواڈرن لیڈر عثمان خاور

سکواڈرن لیڈر عثمان خاور ۲ نومبر ۱۹۵۴ء کو بمقام برج تحصیل و ضلع فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ عثمان خاور نے ابتدائی تعلیم کمالیہ سے حاصل کی۔ اس وقت ان کے والد کمالیہ میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ بعد ازاں والد کی تقرر کی وجہ سے کھاریاں آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ ہائی سکول، کھاریاں سے میٹرک اور ۱۹۷۳ء میں سی بی کالج، کھاریاں کینٹ سے بی اے کیا۔ عثمان خاور نے ۱۹۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم اے انگریزی کیا اور ۱۹۷۸ء ہی میں پاک فضائیہ میں فلائنگ افسر کی حیثیت سے کمیشن حاصل کیا ان کی پہلی تعیناتی کوہاٹ میں ہوئی اور تین سال کوہاٹ گزارنے کے بعد ایف سکس کا مرہ میں ایجوکیشن آفیسر بنے اور کچھ عرصہ بعد ایف ۶ سکول کامرہ کے پرنسپل بن گئے۔ پی اے ایف اکیڈمی، رسالپور، پی ایف کالج آف ایجوکیشن، کراچی اور پی اے ایف بیس، کراچی میں بھی رہے۔ چودہ سال ملازمت کے بعد ۱۹۹۲ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آرمی پبلک سکول ویسٹرج، راولپنڈی اور پی اے ایف انٹر کالج، چکلالہ راولپنڈی میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔ نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد سے بھی وابستہ رہے۔

ہریالیوں کے دیس میں

عثمان خاور کا زیرِ نظر سفر نامہ کتابی شکل میں آنے سے پہلے رسالہ ''فنون'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ انھوں نے یہ

سفر نامہ ازبکستان کی سیاحت کے مشاہدات پر لکھا ہے۔ اس سفر نامہ کو عثمان خاور نے بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ''پی کے۔۲۵۹ میں، مصنف نے اسلام آباد ایئر پورٹ سے تاشقند میں لینڈنگ کے دوران کے مشاہدات کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اگست کی ایک روشن اور خوشگوار صبح کو وسطی ایشیا کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میرا بیگ ناقابل یقین حد تک ہلکا تھا اور جیبیں اس سے بھی زیادہ ہلکی مگر تاشقند میں اشیاء کی ررزانی اور فروانی کے متعلق دوستوں کے پرپگینڈے اور ہمارے رومان انگیز اور ایک حد تک مبالغہ آمیز تصور نے کافی ڈھارس بندھا رکھی تھی۔ اس وقت سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ باقی دنوں سے کتنا مختلف! اگر ان دیکھی سرزمینوں پر اترنے کی خواہش دل میں موجود ہو اور آنکھوں میں امید کے دیئے روشن ہوں تو زندگی حیرت اور مسرت کے خزانے آپ کے سامنے ڈھیر کر دیتی ہے۔'' (۴۷)

پہلے باب میں مصنف کا تجزیاتی انداز، ایئر پورٹ پر مسافروں کے حوالے سے بھی سامنے آتا ہے جب وہ ایئر پورٹ پر مسافروں کی کیفیات بیان کرتے ہیں:

> ''استقبال کے لیے آنے والے پرشوق نگاہوں سے ہر آنے والے میں اپنے پیاروں کا سراپا ڈھونڈنے کی کوشش کرتے اور انہیں نہ پا کر پھر اندر لاؤنج سے آنے والے راستے پر نظریں گاڑ دیتے ہیں جہاں دیر تک ایک باوردی پولیس مین کے سوا کچھ نظر نہ آتا مگر انتظار جاری رہتا اور جب ملاپ کی گھڑیاں آتیں تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے۔ ساری ظاہر داری، سارا رکھ رکھاؤ اندر کے بہاؤ میں بہتا ہوا آنکھوں کے کونوں تک آپہنچتا۔ ایسے موقعوں پر انسان کس قدر قابلِ محبت دکھائی دیتا ہے۔ صاف ستھرا، دھلا ہوا، اندر باہر سے ایک، وصال اور فراق کے لمحے انسان کے چہرے کو کس قدر ردلاویز بنا دیتے ہیں پھر نہ معلوم ان دولمحوں کے درمیان میں پڑنے والے وقفے میں وہی انسان اتنا مختلف کیوں ہو جاتا ہے۔'' (۴۸)

مصنف کی منزل ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند ہے۔ جب اُن کا جہاز افغانستان کے علاقے سے گزرتا ہے تو کچھ اس طرح نیچے کا منظر بیان کرتے ہیں:

> ''موسم بالکل صاف تھا، سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ یقیناً اس میں تمازت بھی ہوگی مگر مجھے تو صرف اس کا سنہرا رنگ نظر آ رہا تھا جسے آسمان کی نیلاہٹ نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ نیچے وہی خشک پہاڑ سنگینوں کی مانند اپنے تکونے سر اٹھائے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے درمیان کہیں کہیں چپٹے سبز ٹکڑے دکھائی دینے لگے پھر وقفے وقفے سے چھوٹی چھوٹی سبز جھیلیں بھی اس منظر میں شامل ہونے لگیں۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی آبادیاں اچانک نگاہوں کے افق پر نمودار

ہوتیں اور پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتیں مگر یہ ایک مختصر وقفہ تھا۔اس کے بعد پھر وہی پہاڑ ہمیں ماننا پڑا کہ افغانستان واقعی پہاڑوں کی سرزمین ہے۔ چوٹیوں پر کہیں کہیں برف کا سفوف بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔'' (۴۹)

دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب تاشقند کی سیر سے متعلق دلچسپ حقائق سے روشناس کراتا ہے۔مصنف ایک عجیب بات بتاتے ہیں کہ تاشقند میں سنہری دانتوں کو خوب صورتی کی علامت مانا جاتا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''تقریباً ہر دوسرا شخص اپنی بتیسی میں کم از کم ایک سنہری دانت لیے پھرتا تھا۔ہم کافی دیر تک اس بات پر حیران رہے اور اس کہ وجہ تلاش کرنے کے لیے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے۔کیا کسی اجتماعی حادثے میں سب لوگ اپنے اکا دکا دانتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے یا ہر شخص اپنے منہ میں سونے کا دانت رکھ کر دراصل اس بات پر احتجاج کر رہا تھا کہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر کیوں پیدا نہ ہوا تھا۔ بہر حال حقیقت اس کے برعکس تھی اور وہ یہ تھی کہ سنہری دانتوں کو یہاں امارت اور خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بھلا امارت اور خوبصورتی کسے عزیز نہیں اور وہ بھی جب اتنی آسانی سے ہاتھ آ رہی ہو لہٰذا حتی المقدور ہر شخص اس ارزاں نسخے سے استفادہ کرتا ہے اور یہ نسخہ بدصورتی اور غربت سے نجات کا قومی تعویذ بن چکا ہے۔'' (۵۰)

عثمان خاور سفر نامے میں، اسلامی تہذیب کے حوالے سے سمرقند اور بخارا کے علم و تہذیب کے مرکز ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ایک وقت تھا جب یہاں ایک ہی تہذیب کی حکمرانی تھی اور یہ وہی تہذیب تھی جس نے عرب و عجم کی تمام وسعتوں کو اپنی شفقت بھری آغوش میں سمیٹ رکھا تھا۔ ماوراالنہر کے یہ علاقے جب سے اسلامی برادری میں شامل ہوئے تھے یہاں علم و حکمت کے دریا بہنے لگے تھے، فقہ و حدیث کی روشنی بکھرنے لگی تھی اور اس روشنی میں یہاں کا ذرہ ذرہ دمکنے لگا تھا۔اُن لوگوں نے صنم خانے کا دروازہ بند کیا تو واقعی کعبے کی پاسبانی شروع کر دی۔سرخ و سپید چہروں اور تیکھی آنکھوں والے یہ لوگ پوری دنیا کو توحید کا درس دینے لگے۔دور دراز کے ملکوں سے سفر کر کے طالبانِ علم کے قافلے سمرقند اور بخارا کی درس گاہوں میں پہنچتے اور علم کے چشموں سے اپنے شوق کی پیاس بجھاتے تھے۔عثمان خاور قدیم اسلامی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ درس مکمل کر کے واپس اپنے اپنے علاقوں کو روانہ ہوتے تو ان کی عباؤں اور عماموں کے ساتھ ساتھ عرفان و آگہی کی لہریں بھی سفر کرتیں اور ہر اس جگہ پر اپنا جادو جگاتیں جسے ان کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوتا اور یہاں کیسے کیسے سورج چمک رہے تھے۔ کیسے کیسے صاحبانِ کمال تھے جنہوں نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔رازی، خورازمی، البیرونی، بوعلی سینا، عبدالرحمٰن جامی۔اس زمانے کا کوئی باکمال شخص ایسا نہ تھا جس نے اپنے آپ کو علم و ہنر کے اس مرکز سے الگ تھلگ رکھا ہو۔'' (۵۱)

دورانِ سفر عثمان خاور اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ بہت سے دلچسپ واقعات بھی پیش آتے ہیں جن کا ذکر سن کر قاری بے اختیار مسکرا دیتا ہے۔مثلاً چائے کے دوران چینی کی تلاش میں انہیں کامیابی نہیں ملتی۔مصنف اس صورت حال کو یوں

بیان کرتے ہیں:

''ہیلو! چینی ،شوگر، ویئر از شوگر؟ اسے چینی کا مقامی متبادل لفظ نہیں سوجھ رہا تھا۔'' آئی ایم شوگر'' پاس کے ٹیبل سے آواز آئی۔ ہم سب کی نظروں نے اس آواز کا تعاقب کیا اور پھر ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ وہاں ایک مقامی شخص بیٹھا تھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر عرفان کو یقین دلا رہا تھا کہ تمہارا گو ہر مراد میں ہی ہوں۔'' (۵۲)

اسی طرح باب'' تاشقند.....اوچن تراشو'' میں مصنف ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب انہیں گائیڈ نہیں ملتا تو فرطِ شوق کے باعث خود سیر کر پروگرام بناتے ہیں۔ انہیں چوک کے ایک جانب سیڑھیاں نشیب میں اترتی نظر آتی ہیں۔ وہ ایک بورڈ بھی لگا دیکھتے ہیں جسے پڑھ نہیں پاتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ''میٹرو'' یعنی انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن ہوگا۔ چونکہ مصنف نے وہاں کی زیرِ زمین ٹرین کا کافی ذکر سنا تھا لہٰذا وہ ایک منفرد اور سنسنی خیز تجربے کے شوق میں نیچے دفتر میں بیٹھی ''سفید بالوں والی بوڑھی اماں'' سے ٹوکن حاصل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''اندر عجیب قسم کی خموشی تھی۔ نہ ٹرین کی آواز نہ لوگوں کی آمد و رفت، نہ لاؤڈ سپیکر پر اعلانات، شاید ٹرینوں کی ہڑتال تھی۔ اگر ایسی بات تھی تو انھوں نے ہمیں ٹوکن کیوں ایشو کیے۔ یہ تو سراسر زیادتی تھی لیکن پھر خیال آیا کہ یہاں تو خود ٹرین کی پٹڑی اور پلیٹ فارم بھی غائب ہیں۔ صرف چھوٹے چھوٹے کیبنوں کی دورویہ قطاریں دور تک نظر آ رہی تھیں۔'' (۵۳)

آخر مصنف اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ وہ ریلوے اسٹیشن نہیں، بلکہ ''ٹوئلٹ'' یا ''ریسٹ روم'' ہے۔

''تو یہ یہاں کی پبلک ٹرین تھی۔ اب ہماری جو حالت تھی، بیان سے باہر ہے۔ پھیپھڑے ہنسی چھپانے میں ہمارے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا رہے تھے کہ مبادا ہنسی بے قابو ہو جائے۔'' (۵۴)

پانچواں باب'' روڈ ٹو سمرقند'' ہے۔ مصنف تاشقند سے بس کے ذریعے سمرقند روانہ ہوتے ہیں۔ دورانِ سفر، وہ امیر تیمور کو یاد کرتے ہیں جو وسط ایشیا کی خاک سے اٹھا اور خون کی ندیاں بہاتا، سلطنتوں کو زیر و زبر کرتا، آندھی اور طوفان کی طرح دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا۔ چھٹا اور ساتواں باب سمرقند کے تاریخی مقامات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ امیر تیمور کے مزار پر جاتے ہوئے، اپنے محسوسات کو مصنف کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''گورِ امیر'' ڈرائیور نے بتایا اور جذبات کی ایک سنسنی خیز لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ کیا وقت اتنا ظالم ہو سکتا ہے۔ رعب اور دبدبے کی ساری عمارتیں، آخر کار زمین پر آ رہتی ہیں اور وقت کا روڈ رولر ان پر یوں چلتا ہے کہ سب کچھ برابر ہو جاتا ہے میرے سامنے تاریخ کے عظیم سپہ سالار، اپنے وقت کے بے مثال اور ماضی کے عدیم النظیر فاتح امیر تیمور کا مزار تھا۔ گورِ امیر، ٹیمبر لین، دی لیم کا مقبرہ جس پر مشرق اور مغرب میں کتنی کہانیاں، کتنے ڈرامے اور تاریخ کی کتنی کتابیں لکھی گئیں آج اس سادہ سے مزار کی تاریک چھت کے نیچے ابدی نیند

سور ہا ہے۔''(۵۵)

اس قدیم بازار کو دیکھ کر عثمان خاور بتاتے ہیں کہ سمرقند شاہراہ ریشم پر ایک اہم تجارتی قافلے وہاں اترتے تھے تو یہی بازار تمام تجارتی و اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے تھے۔ اشیائے تجارت کا مول تول ہوتا، بھاؤ طے ہوتے اور اونٹوں کی مہاریں اٹھالی جاتیں۔ قافلے آگے کو روانہ ہو جاتے۔ اسی باب میں عثمان خاور سمرقند کی تاریخ اہمیت بھی بیان کرتے ہیں۔ آٹھویں باب میں سمرقند کے قدیم بازار کا منظر کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

> ''وسیع و عریض چھت کے نیچے قطاروں کی صورت میں دکانیں بنی تھیں اور ہر قطار میں ایک طرح کی چیزیں فروخت کرنے والی دکانیں تھیں۔ ان قطاروں کے درمیان آمد و رفت کے لیے راستے بنے ہوئے تھے۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ فرش پر کہیں کسی پھل کا چھلکا تک گرا ہوا نظر نہ آیا۔ دیسی قسم کی مٹھائیوں اور تلی جانے والی اشیاء کی دکانیں جو مشرق کے ہر بازار کی پہچان ہیں، یہاں بھی نظر آ رہی تھیں۔''(۵۶)

الغرض انتہائی خوب صورت راستے کے اختتام پر نمودار ہونے والے شہروں کا شہر ثمرقند، ہوٹل زرفشاں کا حسن، امیر تیمور کے مزار پر چھائی ہوئی افسردگی، ڈھلتی شام میں میر بازار گاؤں کا دلفریب منظر، بخارا شہر کی جادوئی روشنیوں کا ذکر، یہ سب لمحات، صنف کے دلکش اسلوب کی بدولت، قاری کو خود پر بیتتے محسوس ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ''ہریالیوں کے دیس میں'' عثمان خاور کا خوب صورت سفر نامہ ہے جو ہمیں سمرقند اور بخارا کی تہذیب سے روشناس اور مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ بحیثیت مجموعی عساکر پاکستان کے مندرجہ بالا اردو سفر نامے اپنی خصوصیات کے باعث اردو ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ گلزار احمد، بریگیڈیئر، تذکرہ افریقہ، کراچی: معارف لمیٹڈ پبلشرز، ۱۹۶۲ء، ص:۱۰۸

۲۔ ایضاً، ص:۱۷۔۱۶

۳۔ گلزار احمد، بریگیڈیئر، تذکرہ چین، لاہور: ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، ۱۹۸۲ء ص:۱۰۸

۴۔ ڈاکٹر عطش درانی، 'ابتدائیہ' مشمولہ، تذکرہ چین از بریگیڈیئر گلزار احمد

۵۔ ایضاً، تذکرہ سنکیانگ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء، ص:۱۱

۶۔ بریگیڈیئر گلزار احمد، تذکرہ حجاز، راولپنڈی: مکتبہ المختار، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص:۱۱

۷۔ ایضاً، ص:۱۸۸

۸۔ ایضاً، ص:۲۵

۹۔ ملک شاہ سوار علی ناصر، کچھ بھی نہ کہا (شاکر کنڈان سے گفتگو)، خوشاب: کرناں پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۴۶

۱۰۔ شاکر کنڈان، جادہ شوق و محبت، سرگودھا: ادارہ فروغ ادب، ۱۹۹۹ء، ص:۲۴۵

۱۱۔ ایضاً، ص:۲۵۲۔۲۵۳

۱۲۔ ایضاً، ص:۴۵

۱۳۔ نامی انصاری، آزادی کے بعد اُردو نثر میں طنز و مزاح، ص:۱۱۹

۱۴۔ کرنل محمد خان، بسلامت روی، راولپنڈی: مکتبہ جمال، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص:۲۰۔۲۱

۱۵۔ ایضاً، ص:۵۱

۱۶۔ ایضاً، ص:۵۷۔۵۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۷۸۔۷۹

۱۸۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، فلیپ، بسلامت روی، ایضاً

۱۹۔ کرنل غلام سرور، مسافر حرم، راولپنڈی: مطبوعات حرمت، ۱۹۸۳ء، ص:۲۶

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۹

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۲۹۔۱۳۰

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۸۲

۲۳۔ لیفٹیننٹ کرنل سکندر خان بلوچ، سولجر نامہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص:۱۲

۲۴۔ ایضاً، ص:۱۲

۲۵۔ ایضاً، ص:۱۳

۲۶۔ ایضاً، ص:۳۹۔۴۰

۲۷۔ ایضاً، ص:۵۸

۲۸۔ ایضاً، ص:۷۳

۲۹۔ ایضاً، ص:۹۲۔۹۳

۳۰۔ ایضاً، ص:۹۳

۳۱۔ ایضاً، ص:۱۱۰

۳۲۔ ایضاً، ص:۱۸۸

۳۳۔ ایضاً، ص:۲۰۷

۳۴۔ لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید، 'مقدمۂ سیر فرنگ، لاہور: کتب خانہ شانِ اسلام، ۱۹۸۳ء، ص:۱

۳۵۔ ایضاً، سیر فرنگ، ص:۲۵

۳۶۔ ایضاً،

۳۷۔ ایضاً، ص:۲

۳۸۔ ایضاً، ص:۸۴

۳۹۔ ایضاً، ص:۴۳

۴۰۔ ایضاً، ص:۵۹

۴۱۔ عرض ناشر، سیر فرنگ، ص: ج

۴۲۔ ارشد نعیم، اُردو ادب بیسویں صدی میں، لاہور: عبداللہ سنز، س ندارد، ص: ۶۵۶

۴۳۔ شفیق الرحمٰن، 'نیل'، مشمولہ دجلہ، لاہور: ماورا پبلشرز، اشاعت دوم ۱۹۹۴ء، ص: ۳۷

۴۴۔ ایضاً، ص: ۴۱۔۴۲

۴۵۔ ریاض احمد قادری 'مضمون'، ڈاکٹر غلام سرور شیخ کا سفر نامہ۔ تکمیل آرزو'، روزنامہ پنجاب نیوز، فیصل آباد: ۱۵ اگست ۲۰۰۲ء

۴۶۔ سید ضمیر جعفری، سورج میرے پیچھے، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص: ۷۷۔۷۸

۴۷۔ ایضاً، ص: ۱۹۹

۴۸۔ سکواڈرن لیڈر عثمان خاور، ہریالیوں کے دیس میں (ثمرقند، تاشقند، بخارا)، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص: ۹

۴۹۔ ایضاً، ص: ۱۷

۵۰۔ ایضاً، ص: ۱۹

۵۱۔ ایضاً، ص: ۲۶

۵۲۔ ایضاً، ص: ۴۰

۵۳۔ ایضاً، ص: ۴۷

۵۴۔ ایضاً، ص: ۴۸

۵۵۔ ایضاً، ص: ۱۰۷

۵۶۔ ایضاً، ص: ۱۱۴

☆.....☆.....☆